ولی دکنی کی شاعری میں تصورِ عشق

ڈاکٹر سیف الدین احمد
شعبہ تاریخ، فیکلٹی آف سوشل سائنس
یونیورسٹی آف دہلی، نئی دہلی

Abstract:

Muhammad Wali Dakani was poet par excellence and a great literary figure whose historical role is unquestionable towards popularization of Urdu literature in North India. He laid the foundation for the ascendancy of Urdu in North India by showing the possibility of Hindavi (mother tongue) as a feasible medium for poetry, especially of the ghazal variety. Wali is regarded as the Adam of Urdu (*Baba-i Rekhta* or *Adam-i Urdu*) poetry and enjoys the same status as that of Chaucer (1343-1400 CE) in English poetry and Rudaki (858-941 CE) in Persian. Wali's most important contribution was to infuse a sense of a new poetics modeled on the Indian style of Persian poetry. Rekhta/Hindi in Delhi acquired a literary status and sophistication under the influence of Wali.

The arrival of Wali's diwan in 1720 CE (2nd regnal year of Muhammad Shah) led to the beginning of a new philosophy of poetry and its compositions provided a jumpstart to Rekhta/Hindi

poetry in Delhi. Persian gradually lost its hold on the masses as well as the elite. This paper briefly explores the historical role of Wali, his linguistic and poetic art especially his ghazals and influence on the development of Urdu language.

The poetry of Wali is important in the sense that it has the prevue of the classical style of poetry which incorporates the sweetness and cache of vocabulary. There are plenty of his verses explicating diverse facets of human experiences of life such as his romantic verses (Ishqiah sha'yri). His poetry has an exclusive style of its own which embodies mastery in compositions, Sufistic piousness, lucidity of Hindi and the firmness and sweetness of Persian language. Ghazal is essentially a means to converse with women; hence the excellence lies in its simple style, tenderness, sweetness and passion. The marvel of his philosophical thought is its simplicity and tenderness. When this simplicity accomplishes brilliance, On the one hand, it attains profundity from the view point of effects and value and on the other it blends with the tongue of common conversation. Wali accomplished this fiat and candor continued to be firmly grounded even in complicated rhymes, which is the rudimentary characteristic of his poetry.

☆☆☆

اردو زبان اگرچہ شمال ہند میں دہلی اور مضافات دہلی کی شہری، بازاری اور لشکری زبانوں کے لسانیاتی اثرات سے گھل مل کر ایک ہیولیٰ بنی۔ لیکن اس کی شاعری نے جنوبی ہند میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور دکن کے ہندوستانی باشندوں کے ہاتھوں کے سہارے گھنٹوں چلنا سیکھا۔ اردو کے یہ دکنی

سر پرست بھی دکن کے اصلی باشندے نہیں تھے۔ بلکہ یہ وہ تھے جو دہلی اور نواح دہلی کے علاوہ پورے ہندوستان سے آکر دکن کے مختلف تمدنی گوشوں میں آباد ہوئے تھے۔ ان کا پہلا گروہ اس وقت دکن پہنچا جب کہ محمد تغلق اپنا دارالسلطنت دہلی سے دکن (1326 A.D.) کے علاقے دیوگری میں منتقل کیا، اور دہلی کی پوری آبادی کو دہلی سے منتقل ہونے کا حکم دیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ہی اس کو دوبارہ دہلی کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کیا ان میں جو صاحب استطاعت تھے وہ تو بہ سہولت دہلی لوٹ آئے لیکن مفلوک الحال طبقہ اپنی بدحالی کی بنا پر وطن کی طرف نہ لوٹ سکا اور دکن ہی میں بودوباش اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔[1] اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد شمالی ہندوالوں کا ایک گروہ جنوبی ہند میں حسن گنگو بانی سلطنت دکن کے ساتھ ادھر آیا حسن گنگو کے لشکر کے سپاہی، دوکان دار اور اہل حرفہ کچھ دہلی اور نواح دہلی کے کچھ پوربی ہندوستان کے باشندے تھے جو وہی زبان بولتے ہوئے آئے جس کا نام اس وقت اردو نہیں ''پوربی'' یا ہندی'' تھا۔ ان کی زبانوں پر وہی دیہاتی اور بازاری گیت تھے جو خالص عوامی جذبات کی آواز تھے۔ عوامی جذبات کی یہی آوازیں اردو شاعری کا ابتدائی ڈھانچہ بنیں اور بنتی رہیں۔

دکن کے بادشاہ امراء اپنے عوام سے اتنے دور نہ تھے جتنے دہلی کے سلاطین ہوا کرتے تھے۔ اس لیے جب انہیں بھی شاعری کا شوق ہوا تو انہوں نے اپنے ذوق شعر گوئی کو عوامی گیت کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ فارسی اگر چہ اس عہد میں بھی دربار اور محل سراؤں میں بولی جانے کے علاوہ علمی وادبی اور سیاسی زبان تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کیوں فارسی شاعری سے کسبِ ذوق نہیں کیا۔ اور اپنے جذبات کی ترجمانی انہیں گیتوں کے اسالیب میں کرنے لگے جو ان کے لشکروں کی زبان پر تھے۔

بہر حال سبب جو کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ دکن کی ابتدائی اردو شاعری میں شمالی ہندوستان کی مقامی بھاشاؤں کے عوامی گیتوں کی گونج ہر جگہ پائی جاتی ہے۔[2] وہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد سے زیادہ کرشن رادھا سے واقف اور مانوس تھے۔ دکن کی عاشقانہ شاعری میں اظہار جذبات عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور ان کے شعروں میں وہی جذبات ہوتے تھے جو گوپیوں کے دل میں اپنے محبوب کرشن کنہیا کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اردو کی دکنی شاعری کا یہ رنگ و آہنگ اس وقت تک رہا جب تک کہ ولی نے اسے فارسی تغزل سے روشناس نہ کرا دیا۔ اس روشناسی نے

ایک نیا قالب اور اس کی ارتقائی رفتار کو ایک نئی سمت بتلائی۔ ۳؎

دکنی غزل نے اپنی ترتیب فارسی غزل سے لی ،لیکن اس کی بنیاد پوری طرح ہندوی روایت پر رکھی گئی۔ دکنی غزل کی اس عوامی روپ کی جھلکیاں محمد قلی قطب شاہ اور اس کے ہم عصر شعراء کی غزلوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح دکنی غزل میں زبان و کلچر کے ہندوی دھارے میں فارسی اثرات اسی طرح مدغم ہونے لگے کہ ماہرین لسانیات اندازہ ہی لگاتے رہے کہ کون سی زبان نے کس زبان کو اپنایا ہے۔ ۴؎ بہر حال اسے ہم ہندا یرانی روایت کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ اور لسانی امتزاج کا یہ عمل فطری تھا۔ اس طرح غزل اس سنگم کا آئینہ دار ہوگئی۔

جنوبی ہند کے حکمراں اور رعایا اس سرزمین سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ اس لیے دکنی غزل کی جڑیں اس سرزمین کی تہذیبی زندگی میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دکنی شعراء نے اپنے ماحول اور اپنے مخصوص تمدن میں غزل کے فنی خدوخال ابھارے اور اسے ایک منفرد آہنگ اور ایک نئے مزاج سے آشنا کیا۔ دکن میں غزل گوئی کا تجربہ خاصا کامیاب رہا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض فارسی اور ہندی آمیزش کو زیادہ مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا چوں کہ کبھی کبھی یہ آمیزش کسی صنف کی اصلی خوبی کے معارض ثابت ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ وزیر آغا کا کہنا ہے ''دکنی دور کی اردو غزل کو نہ تو گیت کا درجہ دیا جاسکتا ہے کہ اس میں گیت کے قدرتی لوچ ،غنائیت اور خود روانی کا فقدان ہے اور نہ اسے غزل کے مزاج ہی کا علمبردار قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس میں غزل کی روانی اور آوارہ خرامی کا رجحان باقی نہیں رہا'' ۵؎

شاعری کی بنیاد تعمیر کرنے کی ابتداء ولی سے ہوئی ،اپنے ہندوستانی عناصر کی بدولت دکنی غزل ایک علیٰحدہ روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہندوستانی تصورات، ماحول، معاشرت کی عکاسی، دکنی غزل کے مزاج اور طرز فکر میں رچے بسے ہوئے ہیں اور انہیں اسباب کی وجہ سے وہاں کی عشقیہ شاعری دوسرے دور کی عشقیہ شاعری سے مختلف ہے۔ یہاں واردات عشق، معاملات عشق اور تصورات عشق سرے سے جداگانہ ہیں۔ دکنی غزلوں میں معشوق ومحبوب کا وہ تصور نہیں جو عام غزلوں کا ہے بلکہ گیتوں سے متاثر ہونے کے سبب یہاں اظہار عشق صنف نازک یعنی عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے نصیر الدین ہاشمی کو اس بات پر شک ہوگیا اور اس بات کے قائل ہوگئے کہ ریختی کی ایجاد لکھنؤ سے قبل

دکن میں ہو چکی تھی جیسے کہ اشعار دیکھیے ۔

کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی الجھو پیتی ہوں میں
تج نے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا

☆

چندر بدن کہا تو کہیں موں سنبھال بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول
(نصرتی)

ابتدائی دور کے دکنی شعراء کی غزلوں کا اگر بغور جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ محبوب اپنی صحیح جنس، اپنے حقیقی خدوخال اور اصلی روپ میں ہر جگہ جلوہ گر نظر آتا ہے یوں تو اس دور میں بھی فارسی غزل کے اثرات پائے جاتے ہیں لیکن دکنی شعراء کا محبوب مرد کے بجائے اپنی ارضی محبوب سے ہم کلام ہے۔ان کے کلام میں محبوب جسم وجان کا ایک زندہ اور ارضی مادی پیکر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ارضی محبت کا نشہ دکنی شعراء کے اشعار میں جاری وساری دکھائی دیتا ہے۔دکنی شاعر نے محبوب کے لیے اکثر جگہ تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے اور یہ خصوصیت بعد کے دور کے شعراء میں ناپید ہوگئی۔دکن کے غزل گو شعراء کے یہاں حسن اپنی جلوہ سامانیوں، اپنی کشش اور جاذبیت کے ساتھ ساتھ اپنی حقیقی جنس میں بھی نمودار ہوتا ہے۔دکنی شاعر محبوب کو گوری سہیلی، گن بھری، سکی، نار، سودھن، موہن، سندری اور پیاری جیسے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔جیسے کے قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں مشہور ہیں۔حسن شوقی، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، نصرتی، بحری، غواصی اور ملک خشنود کے کلام سے چند مثالیں پیش ہیں:

جانا تجے جو دیکھت جگ بھری کتے ہیں
کوئی حور پدمنی کوئی، کوئی شہ پری کتے ہیں
(حسن شوقی)

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا
کہ اس بن نئیں ہمیں یک تل قرار
(محمد قلی قطب شاہ)

اس لیے سیدہ جعفر دکنی غزل گوشعراء کے محبوب کے سلسلے میں کہتی ہیں کہ دکنی غزل گوشعراء کا محبوب اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے دوسرے غزل گوشعراء کے محبوب سے منفرد ہے۔۶ دراصل دکنی شعراء صرف محبوب کے لب ورخسار اور زلف وابر کی دلکشی کی ہی تعریف نہیں کرتے بلکہ وہ بڑے بے باکی اور صداقت پسندی کے ساتھ حسن کی ان تمام رعنائیوں کی مصوری کرتے ہیں جو انہیں مسحور کر دیتی ہیں۔ اس طرز اظہار نے دکنی شعراء کی غزلوں میں عریانی اور بے باکی کا عنصر شامل کر دیا۔

دکنی شعراء نے محبوب مجازی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے خوبصورت تشبیہات ومعنیٰ خیز استعارات سے کام لے کر اپنی تصویروں کو نظر فریب بنا دیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، شاہی عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور ولی کے کلام میں ایسی مسلسل غزلیں موجود ہیں جن میں ایک مخصوص تصویر کی زیریں لہریں پوری غزل میں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ اس لیے دکنی غزلوں کے محبوباؤں کے ان مرقعوں کو دیکھ کر بہت سے ناقدین یہ کہتے ہیں کہ ایلورا، اجنتا اور کھجوراہو کے وہ خوبصورت مجسمے ہیں جن کی اخلاقی حیثیت سے بحث کی جا سکتی ہے۔

دکنی شعراء کے کلام میں مادی حسن اپنے اصلی اور حقیقی روپ میں جلوہ گر نظر آتا ہے، ان شعراء نے صنف غزل میں سراپا گوئی کے لوازم کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسن کی تعریف وتوصیف کو ایک نئی معنویت اور حقیقت پسندی عطا کی، ان شعراء کے جمالیاتی ذوق اور رومانی شعور نے حسن کی ایسی لازوال تصویر پیش کی ہے جو آج بھی دھندلی نہیں ہوئی ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ دکنی غزل گوشعراء صرف عشق مجازی کے پروردہ اور حسن کے گرویدہ تھے، بلکہ ان کے یہاں عشق حقیقی کے وجدان وتصور کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ ان کے شعری افکار اور وجدانی تجربات میں ارضی مزاج اور تہذیبی روایات کی پاسداری کے علاوہ ان کے ذہن میں تصوف اور بھگتی کا بھی اثر محسوس ہوتا ہے جیسے کہ قلی قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی، نصرتی، لطفی ملک خوشنود اور بعض دوسرے شعراء بھی اپنی غزل میں ان مابعدالطبیعاتی تصورات سے کم ہی صحیح سروکار ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن از روئے فکر وفن دیکھا جائے تو ان شعراء کی شاعری کا اصلی جوہر وہاں نکھر کر سامنے آتا ہے جہاں انہوں نے محبوب کے مادی حسن اور اس کی رنگارنگ جلوؤں کی عکاسی کی ہے۔

دکنی عشقیہ شاعری کا ایک روپ وہ بھی ہے جس میں روح برہمن اور محبوب خدا ہے آتما

برہم میں لین ہونے کے لیے بیتاب ہے۔اس قسم کے رنگ کو سگن اور نرگن سالکین نے بڑا فروغ دیا ہے کہ کرشن بھگتی ''سکھی بھاؤ'' بھی اس روایت کی توسیع ہے۔دوسرے لفظوں میں دکنی غزل کے نسائی آہنگ میں ایک نغمہ تصوف کا بھی ہے۔جس میں جزوکل سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے دکنی غزل کے اس رنگ میں جنسی شاعری کے برعکس بڑی پاکیزہ اور مقدس فضا ہے۔بہمنی دور کے شاعر لطفی کا یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

خلوت سے سجن کے میں موم کی بتی ہوں یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت پتی ہوں

لطفی ترے جلن کی پا کی کہاں ہے اس میں جیوں پانچ پانڈواں تے کہتے سودھر پتی ہوں

ولی جدید اردو کے صاحب طرز سخن ور تھے۔بیجا پور اور گولکنڈہ کی دکنی سلطنتیں ان کی آنکھوں کے سامنے نیست و نابود ہو چکی تھیں۔دکن کی سیاسی انتشار اور افراتفری نے انہیں پریشان حال بنا رکھا تھا۔وہ کبھی احمد آباد پہنچے تو کبھی شاہ جہاں آباد کی گلیوں اور خانقاہوں میں نظر آنے لگے ان کی انہیں سیاحی صلاحیت کی بدولت دکنی زبان وشاعری جگہ جگہ روشناس ہوئی۔نتیجے میں حاتم، آبرو اور دہلی کے دور اول کے شعراء نے فارسی گوئی ترک کر کے اردو میں لکھنا شروع کیا۔اس دور کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا ولی کے دہلی آمد نے دوسرے نظریہ سے دیکھتے ہیں اور اس رنگ سخن میں شاعری کرنے کو ولی کی طبیعت کی بے قراری کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔

جب ولی نے غزل گوئی کی ابتداء کی اس وقت دکنی غزل کا تصور صرف یہ تھا کہ غزل عورتوں سے بات کرنے یا حسن و جمال ناز اور اقرار وانکار کے عام سطحی اور خارجی موضوعات ہی شامل ہوتے تھے۔شاہی سے لےکر غواصی تک کے بیان میں خارجی تصور کارفرما نظر آتے ہیں۔سوائے کچھ شعراء محمود حسن شوقی وغیرہ کے یہاں تھوڑی سی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے کہ ولی اسی روایت کو بہت ہی مستحکم طریقے سے آگے بڑھاتے ہیں۔اس لیے جمیل جالبی کہتے ہیں کہ ولی نے اس سطح پر دو امور انجام دیا ہے:

''ولی نے شمال اور جنوب کی زبان کو ملا کر ایک ایسا
ادبی روپ دیا جو بیک وقت دونوں کے لیے قابل
قبول تھا۔اظہار کے اس روپ نے اردو کو فارسی

کی جگہ بٹھا دیا۔ یہ اس وقت سارے معاشرے کی
شدید خواہش اور ضرورت تھی۔''
''ولی کی عظمت کا راز یہ نہیں کہ انہوں نے فارسی
کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا بلکہ ان کا کارنامہ
ہے۔ کہ انہوں نے ایک ایسا رنگ شاعری ایجاد
کیا جس میں ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ فضا
کی خوشبو بھی موجود ہے جس میں حقائق و معرفت
کے مضامین، روحانیت تصوف اور خیالات و
جذبات کا علو ہے تو دوسری طرف اس کا رشتہ اس
زمین سے بھی جڑا ہوا ہے۔''ے

ولی بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ ان کی پوری شاعری پر حسن و عشق کا جلوہ کارفرما نظر آتا ہے محبوب کی اداؤں کی عکاسی اور کیفیتوں کی ترجمانی ان کا خاص میدان ہے۔ یہاں عشق اور سوز عشق کا بیان بہت سادہ اور سرل انداز میں ہوتا ہے جو اردو شاعری میں ایک نئ آواز سنائی دیتی ہے۔ اور دوسری ایک انسان کے دلوں کی دھڑکن اس میں شامل ہے۔

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ
جلوہ گر جب سو وو جمال ہوا — نور، خورشید پائمال ہوا
عشق کے راہ کے مسافر کو — ہر قدم تجھ گلی تین منزل ہے

اے نور جہاں وو دیدۂ تر انتظار میں
مدت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں ۸

عشقیہ شاعری کی اہم خوبی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں سوز و درد کا احساس پیدا ہوا اور ناقدین کا خیال ہے کہ سوز و درد کی کیفیت سے سرور خوشی کی کیفیت میں زیادہ تہہ داری اور معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔ جیسے سید مسعود حسین رضوی فرماتے ہیں:

''اب رہا غم تو وہ شاعری کے لیے خوشی سے کہیں بہتر

ہے، خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی

ہے اور غم بلند ترین حسیات کو پیدا کرتا ہے۔"۹

ولی کے سوز و درد کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔

عشق کے ہاتھ سے ہوئے دل ریش جگ میں کیا بادشاہ ، کیا درویش

جسے عشق کا تیر کاری لگے اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے ۱۰

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

نہ ڈھونڈو شہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانہ تم کہ ہے عشاق کا مسکن کبھو صحرا کبھو پربت

غرض کہ عشق کی مختلف کیفیات، محبت وفاداری کے رشتے اور رازِ عشق کا بیان ولی کی غزل میں بھرپور انداز میں ملتا ہے اور ایسے امکانات کو بروئے کار لایا ہے جن سے اردو شاعری کے سامنے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔

ولی کے تصورِ عشق میں وفاداری بشرط استواری کا عقیدہ بہت اہمیت رکھتا ہے یہاں عاشق نہ بوالہوس ہے کہ حسن پرستی شعار کرے اور نہ ہرجائی ہے کہ دردر جھانکتا پھرے، اس وفاداری کے سبب اس کے یہاں جلنے تڑپنے اور اندر ہی اندر عشق کی آگ میں سلگنے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ شاہیؔ اور نصرتیؔ کی طرح اپنے شکار سے کھیلتا نظر نہیں آتا بلکہ معشوق کی ہر ہر ادا اور اس کے خد و خال سے گرمیِ عشق کو تیز کر کے اپنی کیفیت جذبے اور سوز کو گہرا کرتا ہے۔

آنکھیں ہیں یہ خوباں جہاں کی کہ لگی ہیں

بوٹی نہیں نرگس کی صنم تیری قبا پر

☆

صنعت کے مصور نے صباحت کے صفحے پر

تصویر بنائی ہے ترے نور کو مل کر

ولی کے یہاں عشق میں ایک شائستگی ہے، سنجیدگی اور گہرائی ہے، ضبط و ٹھہراؤ ہے یہاں تصورِ عشق پہلی بار علوی سطح پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ولی کی تخلیقات میں عاشق کا کردار بھی اس کے تصورِ عشق کا ایک پہلو ہے۔ عاشق اپنے عشق میں نہایت مخلص اور ثابت قدم ہے اس کے سامنے

''وفاداری شرط استواری'' کا عقیدہ بہت اہمیت رکھتا ہے اسی وفاداری کے سبب اس کے یہاں جلنے تڑپنے اور اندر ہی اندر سلگنے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔اس کو قدم قدم پر ناکامیوں سے کام پڑتا ہے مگر مایوس نہیں ہوتا۔اضطراب مسلسل کی وجہ سے سرگرداں ضرور ہے مگر دشت نوردی پر سعی مسلسل کا ایک نمونہ ہے جس سے سلیقہ محبت کا ایک مہذب انداز ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے ۔

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے خوخال
حوضِ کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال [11]

☆

نہ جانوں خط تیرا کس بے خطا پر
جلا ہے آج فوجِ شام لے کر

☆

اسے ولی آب اس پری رو کی
مجھ سنے کا غبار کھوتی ہے

عشق کا فلسفہ یا تصور اردو شاعری میں کسی ایک مکتب فکر کی پیداوار نہیں بلکہ یہ تو ہند ایرانی تصورات کا سنگم ہے، نیز اس کلیہ کی بھی صراحت ہوئی ہے۔کہ عشق حقیقی کے لیے عشق مجازی ایک زینہ کا کام کرتا ہے جو حقیقتاً سالک اور بھگتوں کی پہلی منزل اور پہلا پڑاؤ ہوتا ہے۔اس لیے ولی کہتا ہے ۔

درو ادی حقیقت جن نے قدم رکھا ہے
اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا [12]

اس کے بعد وہ عشق کے سوتے کو عشق حقیقی سے ملاتے نظر آتے ہیں۔

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فن عاشقی عجب فن ہے

عشق کا یہ ماورائی یا مابعد الطبیعاتی تصور صوفیا سے منسلک ہے۔عشق کی وہ اعلیٰ سطح جس کو

گوپی چند نارنگ نے عشقیہ شاعری کی اعلیٰ کیفیت سے تعبیر کیا ہے اور جس میں انہوں نے سراج اور درد کی شاعری کو رکھا ہے ان کیفیات عشق تک تو ولی کی رسائی ناممکن ہے لیکن کچھ فارسی شاعری کے اثرات اور مختلف علاقوں یا خانقاہوں کی سیر ان کی میلان طبع کو تصوف کی چوکھٹ کی طرف موڑ دیتی ہے۔ جس کے سبب ان کی شاعری میں بے نیازی اور قناعت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

زندگی جام عیش ہے لیکن فائدہ کیا اگر مدام نہیں

خودی سے اولا خالی ہوا ہے دل اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

ہر ایک سوں متواضع ہو سروردی یہ ہے

سنبھال کشتی دل کو قلندری یہ ہے

خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر

کہ عاشقاں کے نزدیک شیشہ پری یہ ہے

اردو ادب میں ولی دکنی کو خاص مقام اور درجہ حاصل ہے۔ اس کی شخصیت جامع کمالات تھی وہ اپنے ادبی کارناموں میں کسی جگہ عالم وفاضل مصلح ومشہیر، صوفی وصافی کی حیثیت سے رونما ہوتا ہے اور کہیں کہیں ادیب وانشا پرداز دکھائی دیتا ہے۔

ولی نے مختلف صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو اس نے خاص طور پر اپنایا۔ ولی کی شاعری بہت پہلودار نظر آتی ہے لیکن ولی کی شاعری کے دو نمایاں پہلو مجاز وحقیقت ہیں جو کہیں الگ الگ اور کہیں ملے جلے روپ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جہاں اس نے تصوف کو تغزل کے رنگ میں اسی خوبی سے پیش کیا ہے کہ مجاز وحقیقت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ولی کی شاعری کا مجازی پہلو بھی رسمی وروایتی نہیں یہ بھی اس کے قلب ونظر کی سچی روداد ہے۔ مجازی پہلو میں ولی کا محبوب کوئی فرد واحد نہیں ہے بلکہ وہ ہر انسان اس کے لیے محبوب کی حیثیت رکھتا ہے جن میں اس کو حسن ازل کا پرتو نظر آتا ہے۔ حسن کسی صورت میں نظر آئے ولی اس کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یہی شدت احساس اس کا عشق ہے جو اس کے قلب ونظر کی گہرائیوں کا حقیقی ترجمان ہے:

در وادی حقیقت جن نے قدم رکھا ہے

اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

پھر وہ جلد ہی حقیقت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے

کہ فن عاشقی عجب فن ہے

مجاز ہو یا حقیقت اس شدت احساس سے جو کیفیت رونما ہوتی ہیں دل میں جو جذبات و احساسات موجزن ہوتے ہیں اور جو وارداتیں گزرتی ہیں ولی ان کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح اس کی آپ بیتی جگ بیتی کی شکل اختیار کر لیتی ہے یہی مادی فضا اور ہمہ گیری و ہمہ جہتی اس کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ولی کے خلوص و احساس کی وجہ سے اس کے کلام میں سوز و گداز بھی بلا کا پایا جاتا ہے اور اسی خلوص نے اس کے کلام کو پر تاثیر بھی بنا دیا ہے۔ اس کی شدت احساس اور خلوص و احساس کی تصدیق اس کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے۔

بے حقیقت گرم جوشی دل میں نین کرتی اثر

شمع روشن کیوں کہ ہووے شعلہ تصویر سوں

ولی کا کلام اس کے تصورات و تاثرات کا حسین امتزاج ہے۔ ولی عشق کو شغل و فن، یاری و رہبر گردانتا ہے وہ اس کو انسانیت کی اہم ترین قدروں میں شمار کرتا ہے۔ عشق کو مادی علم میں انسان کو مسرور کامیاب بنانے کا بھی آلہ تصور کرتا ہے مگر یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ یہ مرحلہ شوق بہت دشوار گداز ہے اسی لیے وہ کہتا ہے۔

اے ولی طرز عشق آسان نہیں

آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے[۱۳]

خوب روح خوب کام کرتے ہیں

ایک نگہہ میں غلام کرتے ہیں

اس رنج و غم اور گریہ و شوق میں اس کا فلسفہ غم مضمر ہے۔ اس کے یہاں عاشق کے درد و غم اور اس کے پردے میں حیات انسانی کی محرومیوں کے ذکر میں قنوتی (غم) رجحان نہیں پایا جاتا بلکہ شرح غم کے مطالعہ سے بلند حوصلگی و توانائی پائی جاتی ہے ولی کا فلسفہ غم اس شعر سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

جب تلک ہے آسمان و زمین جگ میں برقرار

جیوں پھول اس جہاں کے چمن میں ہنسا کرو

☆

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں

خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ولی کے عہد میں اردو شاعری پر ہندی کا اثر غالب تھا۔ ولی نے ہندی کے ضروری اور غیر ضروری عنصر میں امتیاز کیا اور چھانٹ پھٹک سے کام لیا اس تراش وخراش سے زبان میں نکھار اور وسعت پیدا ہوگئی ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مذہبی، تاریخی، تلمیحوں تشبیہوں اور استعاروں، دریاؤں پھلوں سازوں راغوں کو شاعری میں جگہ دے کر اپنی وسیع القلبی ،حب الوطنی اور دور بینی کا ثبوت دیا۔ ولی کے یہاں ایسے اشعار کی کثرت ہے جو زندگی کے گہرے اور رنگا رنگ تجربات کو سامنے لاکر ہمارے شعور واحساس کا حصہ بنادیتے ہیں ۔ اس کے اشعار سوتے ہوئے جذبوں کو جگا کر ہمارے شعور کو وسیع اور سہل بنادیتا ہے۔

شب فرقت میں مونس و ہمدم

بے قراری وآہ زاری ہے

ولی نے غزل کا دامن اپنی کاوشوں سے اتنا وسیع کردیا کہ اس میں ہر قسم کے خیالات، موضوعات، احساسات، تجربات، جذبات اور واردات کے اظہار کا سلیقہ پیدا ہو گیا اور اردو غزل کو وہ رنگ سخن مل گیا جو آج بھی زندہ اور باقی ہے۔ ولی کی غزل میں اردو غزل کی کم وبیش وہ ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں جو سراج سے لے کر داغ تک مختلف شاعروں کی انفرادیت کی نشانیاں ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

1. Agha Mehdi Husain, *Rise and Fall of Muhammad Bin Tughluq* (London: Luzac & Co., 1983), pp. 108- 118; Richard M. Eaton, 'The Rise of Written Vernaculars: The Decan, 1400-1650', in Francesca Orsini and Samirah Sheikh ed. *After Timur Left: Culture and Circulation in fifteenth-century North India* (Delhi: Oxford University Press, 2014), pp. 116-117; Habib and Nizami eds., *A Comprehensive History of India*, Vol. V, pp. 506-515

۲۔ شیخ چاند، ولی کی اہمیت، مرتب سید احمد، یادگار ولی، ص ۱۰۸

۳۔علی احسن مارہروی، کلیات ولی اورنگ آبادی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۷، ص ۱۹۸۔۱۰۴

۴۔نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۶، ص ۳۶۔ ۳۹

۵۔وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج، ص ۲۳۵

۶۔کامل قریشی: اردو غزل، ص ۳۸

۷۔جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، ص ۵۴۰

۸۔نورالحسن ہاشمی، کلیات ولی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۸، ص ۲۰۳

۹۔ سید مسعود حسن رضوی: ہماری شاعری، ص ۱۳۶

۱۰۔نورالحسن ہاشمی، کلیات ولی، ص ۲۳۱

۱۱۔علی احسن مارہروی، کلیات ولی، ص ۱۳۲

۱۲۔نورالحسن ہاشمی، کلیات ولی، ص ۸۳

۱۳۔نورالحسن ہاشمی، کلیات ولی، ص ۲۸۳۔